© rasailojaraid.com

پروفیسر شیخ محمود احمد

مردِ درویش

میرے ذہن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا نمایاں ترین نقش ان کی درویشی ہے۔ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آئے ہوئے تھے۔ حیدر آباد یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تھے اور ریاست حیدر آباد کے سقوط کے بعد کوئی پنشن ملنے کی توقع نہ تھی۔ ابھی پاکستان میں بھی نہ کوئی کام کر رہے تھے نہ حسب طبیعت کوئی کام ملنے کی امید تھی پنشن لینے کے بعد اپنے آبائی وطن کشمیر میں سکونت کا ارادہ رکھتے تھے اور اسی خیال سے جنگ کے دوران میں جب سوائے صنعت کار یا تاجر پیشہ کے کوئی اور مکان بنانے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا انہوں نے سری نگر میں بڑا پیارا بنگلہ تعمیر کروایا۔ زندگی کی تمام سہولتیں اس میں جمع کیں۔ پچاس کنال کے قریب زمین بنگلہ کے ساتھ لی اور اس میں باغ لگوایا۔ زندگی بھر کی جمع کی ہوئی کتابیں اس میں رکھیں۔ لیکن وہاں بھی حالات اس سرعت سے بدلے کہ آتے ہوئے اپنا کار بھی نہ لا سکے۔ زندگی بھر کا اثاثہ اس مکان پر لگا چکے تھے۔ اب نہ تنخواہ رہی تھی نہ پنشن۔ نہ مکان نہ کتابیں۔ نہ زندگی کی دیگر سہولتیں اور ضرورتیں۔ میں انہیں چھ سال پہلے سے جانتا تھا اور بے انتہا حیران تھا کہ ان کے لباس اور فرنیچر اور کھانے میں تو فرق تھا لیکن ان کی علمی گفتگو، ان کے اشعار، ان کے لطیفے اور بذلہ سنجی اسی جگہ قائم تھی۔

میں اس سے چند ہی ماہ پہلے ہجرت کر کے کشمیر سے لاہور پہنچا تھا۔ میری عمر اس وقت ۲۲ سال تھی اور ان کی ۵۶ مستقبل اور زندگی میرے سامنے تھی اور ان کی پشت پر۔ وہ ایک زندگی کا اثاثہ لٹا کر آئے تھے اور میرے پاس تھا ہی کیا جو لٹاتا۔ میں اس زمانہ میں حوصلہ، یقین اور مثبتیت کا درس لینے لاہور جیسے علمی گہوارے میں اسی لٹے پٹے بوڑھے کے پاس حاضر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں انہیں ایک اور نقصان بھی ہوا۔ ایک عزیز آئے اور ان سے ۲۵ ہزار روپے مانگ کر لے گئے کہ کاروبار میں لگائیں گے۔ خلیفہ صاحب روپیہ دیتے ہوئے گھر میں کبھی مشورہ نہ کرتے تھے۔ جس نے جو مانگا اگر پاس ہوا تو فوراً دے دیتے تھے۔ کاروبار میں نقصان ہوا تو گھر میں معمولی طور پر بات کر چھوڑی جیسے پانچ دس روپے کی بات ہو۔ گھر والوں کو قدرتاً تشویش تھی کہ روپیہ مانگنا چاہیئے۔ پیچھا کرنا چاہیئے۔ لیکن ان کا یہ کہنا بھی انہیں ناگوار ہوتا تھا۔ کہتے تھے جب ہو گا ضرور دے دیگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب بھی ان سے کسی کام کاج کی بات کی جاتی تو فوراً ٹال دیتے۔ بہت مجبور کرتے تو کہہ دیتے کہ ساری عمر پڑھتے رہے ہیں ذرا جم کے بیٹھے تو کچھ لکھ بھی ڈالیں گے۔ رہنے کو گھر تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ بھی نہ ہوتا تو اتفاقاً اندرونِ موچی دروازہ ایک آبائی مکان تو ہے ہی اس میں میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ وہاں بھی بڑے مزہ سے رہ سکتا ہوں۔ اور پھر کوئی حکایت، کوئی لطیفہ، کوئی علم وحکمت کی بات کر دیتے۔ غالباً ایک ایسے ہی موقع پر حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات سنائی کہ وہ علاوہ علم وعرفان میں بلند مقام رکھنے کے دنیوی ثروت میں بھی بڑے ممتاز تھے۔ وہ بہت بڑے بین الاقوامی تاجر تھے۔ اس پیمانے کے کہ انہیں اسبابِ تجارت کی حمل ونقل کے لیے اپنے جہازوں کا بیڑا رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ درس فرما رہے تھے کہ کوئی کارندہ گھبرایا ہوا آیا اور کہا تمام جہاز فلاں ملک سے واپس آتے ہوئے سمندری طوفان میں گھر گئے اور سامان سمیت سب ڈوب گئے۔ سید والا مقام نے کہا الحمدللہ اور درس پہلے کی طرح جاری رکھا۔ دوسرے روز پھر درس فرما رہے تھے کہ وہی کارندہ بھاگا بھاگا آیا اور کہا کہ کل والی اطلاع غلط تھی۔ طوفان تو واقعی شدید تھا لیکن قدرت کا معجزہ ہے کہ کوئی جہاز بھی نہیں ڈوبا۔ حضور جیلانی نے کہا الحمدللہ اور درس پہلے کی طرح جاری رکھا۔ ایک طالب علم جو دونوں روز موجود تھا پوچھے بغیر رہ نہ سکا کہ حضور آپ نے کل جہازوں کے ڈوبنے کی خبر سن کر بھی الحمدللہ کہا اور آج جہازوں کے بچ جانے پر بھی الحمدللہ کہا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ حضور نے جواب دیا کہ جب ڈوبنے کی خبر سنی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ کہیں اس خبر سے اس میں کوئی مایوسی یا رنج یا تکلیف کا جذبہ تو نہیں پیدا ہوا۔ چونکہ ایسی کوئی چیز دل میں موجود نہیں تھی اس لیے میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کہا الحمدللہ۔ دوسرے روز جب سب جہازوں کے بچ نکلنے کی خبر ملی تو میں نے پھر دل کو ٹٹولا کہ اس میں کہیں فخر وناز یا کم از کم غیر معمولی مسرت اور اٹھان تو نہیں۔ اور چونکہ یہ جذبہ بھی نہیں تھا اس لیے میں نے دوبارہ اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا اور الحمدللہ کہا:

دل حریم اوست جز با او مدہ

چنانچہ اپنی تکلیف کی نہ بات کرتے تھے نہ ان کی نشست وبرخاست اور گفت وشنید سے اس کا کوئی اثر ان پر نظر آتا تھا۔ البتہ ملنے والے سے اس کی بات ضرور کرتے تھے۔ میں بھی ابھی ہجرت کے بعد ملازم نہیں ہوا تھا، مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ روپے کی تنگی نہ ہو تو آدمی ملازمت کا دھندا کبھی نہ کرے۔ کہنے لگے روپیہ ہو تو کیا کرو؟ میں نے کہا فلاں کاروبار کر لوں۔ تفصیلیں پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کتنا روپیہ ہو تو یہ کام کر سکو گے؟ میں نے کہا دس ہزار اور پھر کچھ اور بات ہوتی رہی۔ اسی دوران اندر گئے اور میرے ہاتھ میں ایک چک دے دیا۔ میں نے رقم دیکھی تو دس ہزار روپیہ تھی۔ چک بیرر تھا اور حسب معمول نہ رسید نہ پرچہ۔ میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگے اس کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ جیسے درس وتدریس سے تعلق رکھنے والوں سے کاروبار کیا ہوتا خود ہی کہا کرتے تھے جو کچھ جانتے ہیں وہ کچھ کر بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیتے ہیں اور جو کچھ نہیں جانتے وہ پڑھا لیتے ہیں) کچھ ہی دنوں میں بارہ سو کا نقصان کر دیا۔ ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے کاروبار میں یہ ہوتا ہی ہے اور تمہیں معلوم نہیں بنیوں کی ایک کہاوت ہے پہلے سال چٹی، دوسرے سال وٹی اور تیسرے سال کھٹی۔ یعنی پہلے سال نقصان ہوتا ہے، دوسرے سال معاملہ برابر رہتا ہے اور تیسرے سال منافع ہوتا ہے۔ میں جو پہلے ہی اتنے درویش صفت آدمی سے دس ہزار روپیہ باوجود ان کی نازک مالی حالت کے لے چکا تھا، اپنے آپ میں پہلے دو سالوں کی کٹھن منزلوں کو برداشت کرنے کی اخلاقی قوت نہ رکھتا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ باقی رقم ان کو لوٹا دوں اور نقصان والا حصہ پھر کبھی انہیں دے دوں۔ جب رقم کا چیک انہیں دیا اور بقایا کے متعلق کہا تو کہنے لگے کہ یہ تو اشتراک کا معاملہ ہوتا ہے۔ بارہ سو کا نقصان ہوا ہے تو چھ سو مجھے برداشت کرنا چاہیئے اور چھ سو تمہیں۔ اس وقت تو خیر میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور انہوں نے بھی کبھی اس چیز کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ دو تین سال کے بعد میں نے نقصان والی رقم کا چیک بھیجا۔ مجھے ایسا خط لکھا کہ جیسے ان میں نہ کوئی نیکی تھی اور نہ ہے اور دنیا بھر کی نیکی اور دیانت میرے ہی حصے میں آئی ہے!

مشہور مصنف لوئی فشر نے MEN AND POLITICS میں اپنی ایک گھریلو بات لکھی ہے۔ وہ اس زمانے میں ماسکو میں رہتے تھے۔ ان کے پانچ سالہ بچے نے اپنی ماں سے جو خود بھی مشہور جرنلسٹ ہیں اخبار پراودا میں ایک کارٹون کا مطلب پوچھا۔ ماں نے کہا اس کا مطلب تم نہیں سمجھ سکتے تو بچے نے فوراً جواب دیا کہ اگر آپ واقعی کسی چیز کو سمجھتی ہوں تو آپ ضرور اسے سمجھا سکیں گی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ان یگانۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے جنہیں کبھی کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم فلاں چیز سمجھ نہیں سکتے۔ انہوں نے علم و شعر و حکمت کو اس حد تک سمجھا ہوا تھا کہ وہ اسے لطیفوں اور حکایتوں کی شکل میں فلسفہ و شعر سے نابلد لوگوں کو بھی سمجھا سکتے تھے۔ علم و حکمت کا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ ایسا نہ تھا جو ان کی زبان سے سننے کے بعد اپنی گرہ کھول نہ دیتا ہو۔ انداز ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ جواب کسی شعر سے شروع کرتے یا کسی لطیفہ یا کہانی سے اور اس شعر کی تشریح میں یا اس کہانی یا لطیفہ سے منسلک قہقہے میں ساری دقت یوں دور ہو جاتی کہ حیرت ہوتی تھی کہ دقت تھی کہاں۔

لیکن اب اس چیز کو دہرانا اور بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ اس چیز کا احساس اس وقت بھی تھا جب وہ زندہ تھے کہ انمول موتی ان کے منہ سے نکل کر ہوا میں غائب ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی زندہ قوم ہوتی تو دو اسٹینوگرافر ہر وقت ان کے ساتھ رکھتی جو ان کی ہر بات کو ضبطِ تحریر میں لے آتے اور اگر یہ ہوتا تو آج بیسیوں جلدیں علم و حکمت سے بھری ہوئی قوم کو زندگی کا درس دینے کے لیے موجود ہوتیں۔

قوم کو کیا کھول خود اپنی خامی پر دکھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن ہم میں موجود تھے، ذرا آگے بڑھ کر باسول بن جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن کبھی بھی گھر جا کر وہ بات نہ لکھی جو ان کی زبان سے سنی تھی۔ سوائے ایک بار کے، وہ بھی آج سے پندرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سال پہلے اور وہ بھی اب ملتی نہیں۔

اب تو صرف وہ کتابیں ہیں جو انہوں نے خود لکھیں۔ لکھنے کا اسلوب وہی تھا جو بات کرنے کا تھا۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور لکھے ہوئے کو دہراتے نہیں تھے۔ یہ بحیثیت مصنف ان کی خامی تھی اور جب وہ زندہ تھے تو میں نے کئی بار ان سے اس کی شکایت بھی کی۔ لیکن اب خوش ہوں کہ وہ ہماری طرح دہرانے اور سہرانے نہیں بیٹھے ورنہ شاید وہ دولت بھی ہمیں نہ ملتی جو خوش قسمتی سے اب ہم سے چھین نہ سکے گی۔

میں نے عمداً اس مضمون کا عنوان مرد درویش رکھا ہے حالانکہ وہ علم و عرفان کا ایک سمندر بھی تھے اور اس پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اپنی کوتاہ قلمی اور کوتاہ علمی ہے کہ نہ ان کے علم کو بیان کر سکتا ہوں اور نہ ان کے اسلوب کی کوئی مثال اب یاد ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا تخاطب ذہن سے زیادہ قلب و وجدان سے ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ شعور میں کوئی بات نہیں اور کم از کم خوش فہمی یہ ضرور ہے کہ وجدان میں سب باتیں محفوظ ہیں۔

جب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ قائم کرنے کے لیے حکومت نے انہیں معین کیا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے مچھلی کو پانی مل گیا ہو۔ ادارے کو انہوں نے بے انتہا باعمل ادارہ بنایا۔ کئی لالچ ان کے راستے میں ایسے آئے کہ کوئی دنیا دار ہوتا تو ادارے کو چھوڑ دیتا۔ مثلاً دو بار پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری انہیں پیش کی گئی۔ لیکن دونوں بار انکار کر دیا کہ میں اس ادارہ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بار تو میں نے بھی ان سے پوچھا کہ وہ کیوں انکار پر مصر ہیں، جو جواب دیا وہ الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم میرے جیسا معاشیات کا طالب علم اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ کام کی قدر یافت کی قدر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

کسی کے متعلق برائی یا بدنیتی کا وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ جب سری نگر کا بنگلہ بنانا تھا تو ڈیزائن تیار کروالیا اور ایک کارندہ مقرر کر دیا کہ اس کے مطابق چیز بنوا دے۔ اس حد تک تو ان کی مجبوری جائز تھی کیونکہ نہ کسی قسم کی بھاگ دوڑ کا کام انہوں نے خود کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے۔ جس انداز سے وہ کارندہ خرچ کر رہا تھا اس سے صاف نظر آتا تھا کہ جنگ کی گرانی کے علاوہ بھی کوئی غیر معمولی وجہ اس خرچ کی تھی، اور وہ وجہ باقی سب لوگوں کو نظر آ رہی تھی سوائے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے۔ کوئی کچھ کہتا بھی تو جواب دیتے آپ۔ لوگ خواہ مخواہ بدظنی کر رہے ہیں۔ چنانچہ مکان کی تکمیل کے بعد بھی وہ ان کا ملازم رہا اور باغ لگانے کا کام بھی اسی سے کروایا گیا۔

اسی طرح ایک اور کارندہ تھا جسے تھل میں باغ لگوانے کے لیے ملازم رکھا۔ مختلف حیلوں سے وہ جائز خرچ سے ہزاروں روپیہ زیادہ وصول کرتا رہا۔ سب جانتے تھے کہ وہ ان کی تن آسانی اور روپے پیسے کے معاملے میں تفصیل سے گریز سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن آخر تک انہیں اس کی ایمانداری کا قطعی یقین تھا اور اگر کوئی شبہ کی بات کرتا بھی تو وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوں محسوس کرتے جیسے دوسرے کا شبہ بھی ان کا اپنا قصور ہے، چنانچہ اولیں فرصت میں وہ اس کے لیے کپڑے یا کوئی اور تحفہ ضرور بھجوا دیتے، اور چونکہ وقت گزرنے اور معاملہ کی اور وضاحت ہونے کے ساتھ زیادہ لوگ زیادہ موقعوں پر یہ بات کہنے لگے۔ اس لیے تحفوں کی مقدار بھی ہمیشہ بڑھتی ہی رہی۔ میں اس کا زندہ سے ان کی وفات کے بعد نہیں لا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں ایک فرشتہ سمجھتا ہو گا۔

اور کون جانے کہ وہی ٹھیک سمجھتا ہو!

مسئلہ زمین اور اسلام

مصنفہ شیخ محمود احمد

زرعی مسائل کا صحیح حل پاکستان کی سیاسی اور معاشی زندگی کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے لیکن اس کے باوجود ان مسائل کو قوم نے نظر انداز کیا ہے یا غلط انداز سے ان پر بحث کی ہے جو گمراہ کن ہے۔ اس بہت بڑے خلا کو پورا کرنے کی یہ ایک سعی بلیغ ہے۔

صفحات ۲۲۴ - قیمت ۴/۴ روپے

اسلام اور رواداری

مصنفہ رئیس احمد جعفری

قرآن کریم اور حدیث نبوی کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا حسن سلوک روا رکھا ہے اور انسانیت کے بنیادی حقوق ان کے لیے کس طرح اعتقاداً اور عملاً محفوظ کیے ہیں۔ حصہ اول قیمت ۴/۷ روپے حصہ دوم قیمت ۸/۷ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ - کلب روڈ - لاہور

© rasailojaraid.com